(غلام گردش)

کیا ہم دوزخ میں رہ رہے ہیں؟

اُستاد سلیم اقبال کا نام تک لوگ بھول چکے ہیں۔فراموش ہی کر دینا چاہیے۔اسلیے کہ تمام اہل ہنر،مملکت خداداد میں ہر قسم کی ناقدری کا شکار رہے اور ہیں۔کیا موسیقار،کیا شاعر،کیا آرٹسٹ،کسی بھی طرح کے اہل ہنر کیلئے یہ ملک حد درجہ تکالیف کا باعث ہے۔اُردو کے نامور ادیب مستنصر حسین تارڑ نے کہا ہے ''کیا یہ تو نہیں کہ اس خطے میں قیامت آ کر چلی گئی ہے اور ہم سب جہنم میں رہ رہے ہوں''۔ویسے مجھے یہ فقرہ کبھی کبھی سچ معلوم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔جب بھی یورپ یا امریکہ جاتا ہوں تو جملے کی سچائی میرے سامنے حقیقت کی صورت میں سامنے آجاتی ہے۔تمام تہذیب یافتہ ممالک،تصادم سے نکل کر راحت کی دنیا میں داخل ہو چکے ہیں۔تشدد پسندی،عدم برداشت اور بدصورتی سے کافی آگے۔مقصد ہمارے خطے اور مغرب کا مقابلہ نہیں ہے۔کیونکہ ہم ماضی میں رہنے والے بدقسمت لوگ ہیں،جو حال میں بے حال اور مستقبل سے مکمل بے خبر ہیں۔اس افراتفری میں،سلیم اقبال کا نام یاد نہ رہنا معمول کی بات ہے۔ویسے بتایئے۔مذہبی حوالوں کے علاوہ ہمیں کس کا نام آتا ہے۔کسی بھی عامی سے دریافت کریں کہ دنیا کے موجودہ پانچ بڑے سیاستدانوں،مصوروں،صداکاروں اور اس ترتیب کے لوگوں کے نام بتائیں تو اکثر مکمل طور پر خاموش ہو جائینگے۔کیونکہ ہمارا ذہن اس قدر منتشر کر دیا گیا ہے اور ہمیں یقین دلا دیا گیا ہے کہ ہماری دنیا کی کوئی اہمیت نہیں۔یہ ایک غلیظ اور گندی چیز ہے۔اس پر توجہ بالکل نہیں دینی چاہیے۔اس سوچ کو رائج کیا گیا ہے اور اب یہ ایک طبقاتی فرق کو ظاہر کرتی ہے۔

میڈیکل کالج میں اُستاد سلیم اقبال سے کیسے ملاقات ہوئی۔یہ اب کافی عجیب سا لگتا ہے۔ہمارا ہاسٹل یعنی کے ای کا ہاسٹل،گوالمنڈی کے کونے پر تھا۔ہم کسی بھی تعین کے بغیر اس جگہ جاتے رہتے تھے۔وہاں ایک دکان تھی جس میں ایک مہین سا آدمی لکڑی اور تاروں کو جوڑ کر ستار بناتا تھا۔ایک دن اس طرف گیا،تو وہاں کوئی شخص سارنگی بجا رہا تھا۔معلوم ہونا چاہیے کہ سارنگی حد درجہ مشکل ساز ہے۔ایک لہیم شہیم اجنبی آنکھیں بند کیے مقامی دھنیں بجانے میں مصروف تھا۔خوبصورت آواز سنکر دکان میں داخل ہو کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔یہ میری پہلی ملاقات تھی۔سلیم اقبال دراصل دو بھائی تھے۔سلیم اور اقبال۔مگر عجیب بات ہے کہ لوگ انہیں ایک آدمی ہی کا نام سمجھتے ہیں۔بہر حال واقفیت کی ابتدا ہوئی اور پھر دوستی ہو گئی۔اکثر ہوتا تھا کہ،کلاسوں سے فارغ ہو کر واپس آتا تھا۔تو سلیم اقبال صاحب نیو ہاسٹل کی گراؤنڈ فلور پر سٹینڈ پر لگے اخبار پڑھ رہے ہوتے تھے۔کسی اور کی بات نہیں کرونگا۔مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ یہ کس درجہ عظیم موسیقار ہے۔تمام دوستوں میں ارشد بٹ،یعنی مردِ صحرا ہی سلیم صاحب کی موسیقی کے درجہ کو سمجھتا تھا۔ویسے میں مردِ صحرا کو بھی فنکار سمجھتا ہوں۔ارشد ایک حیران کن انسان ہے۔وہ شخص جو بارہ تیرہ سال کی عمر میں ملک کے مایہ ناز ادیبوں کو خط لکھتا ہو اور انکے جواب ترتیب سے اپنے پاس محفوظ رکھتا ہو۔جو بچپن میں نصرت فتح علی خان کی قوالی شوق سے سنتا ہو۔اس وقت جب خان صاحب کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ارشد بٹ،اس گھرانے کی موسیقی پر سیر حاصل بات کرتا تھا۔اب ارشد بٹ میری طرح ساٹھ سال سے اوپر کا ہو چکا ہے۔جتنا پختہ مطالعہ،دین پر دلیل سے بات کرنے کی اہلیت اور غیر متعصب تجزیہ،مردِ صحرا کا ہے۔بہت ہی کم لوگوں کا خاصہ

ہوسکتا ہے۔کم ازکم، مجھے اس صلاحیت کا کوئی دوسرا شخص نہیں ملا۔ہاسٹل میں سلیم اقبال صاحب، میرے تمام دوستوں کے بھی دوست بن گئے۔اب عملی طور پر ہوتا یہی تھا کہ اگر میں کمرے میں نہیں بھی ہوں، تو استاد جی آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ہاں، کمرے میں ایک ہارمونیم بھی پتہ نہیں کدھر سے آ چکا تھا۔اعزاز حاصل ہے کہ اُستاد سلیم اقبال کو بارہا، نئی دھنیں بناتے ہوئے دیکھا ہے اوران سے اَن گنت بار غزلیں سننے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔

اچھی طرح یاد ہے کہ انکے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔یعنی گاڑی یا موٹر سائیکل نہیں تھا۔ایک دن کہنے لگے کہ ریڈیو سٹیشن پر پروگرام ہے۔وہاں چلتے ہیں۔میرے پاس موٹر سائیکل تھی۔ویسے اب سوچتا ہوں تو نہیں ہونی چاہیے تھی۔اسلیے کہ طالبعلم کی دنیا صرف اور صرف اسکا پروفیشن ہوتا ہے۔یعنی کتابیں۔دیگر علوم کیلئے عمر کا خاصہ طویل حصہ پڑا ہوتا ہے۔ریڈیو سٹیشن لاہور پہنچے تو ایک سپاٹ سی عمارت نظر آئی۔کسی قسم کے رنگ کے بغیر۔سلیم صاحب، اندر گئے۔جس شخص سے ملنا تھا شائد وہ نہیں تھا۔اسلیے فوری طور پر باہر آ کر، ہم دونوں کینٹین کی طرف چل پڑے۔کینٹین کا موحول وہی تھا جو ہوتا ہے۔یہ 1982 کی بات ہے۔اندر پہنچے تو میری نظر غلام علی پر پڑی۔غلام علی میرا پسندیدہ فنکار تھا اور اسے یک دم سامنے پا کر ایک نایاب سی مسرت ہوئی۔ایک ایسی خوشی جسے بتانا حد درجہ مشکل سا ہے۔سلیم اقبال اور غلام علی کی کافی دوستی تھی۔تھوڑی دیر میں بے تکلفی سے باتیں شروع ہوگئیں۔بتاتا چلوں غلام علی اس وقت بہت مشہور ہو چکے تھے۔محسوس ہوا کہ انسانی سطح پر انتہائی مٹا ہوا انسان ہے۔پتہ نہیں کیوں، سلیم اقبال نے غلام علی سے فرمائش کی کہ کوئی غزل سناؤ۔لکڑی کی میز پر غلام علی نے انگلیوں سے طبلہ بجانا شروع کر دیا اور مشہور زمانہ گانے سنانے شروع کر دیے۔کمال آواز۔پورے سوز کے ساتھ۔اب بھی غلام علی کی آواز اور ریڈیو پاکستان کی کینٹین یاد ہے۔پنجابی گانے کے بول تھے۔''تیرے شوق دا نئی اعتبار مینوں''۔یہ اس وقت حد درجہ زبان زد عام تھا۔سلیم اقبال صاحب خاموشی سے سنتے رہے۔اختتام پر پنجابی میں صرف ایک جملہ کہا۔کہ غلام علی اچھا گاتے ہو۔ابھی تک فراموش نہیں کر پایا کہ اس ایک فقرے کی تعریف پر غلام علی کس قدر خوش نظر آیا۔

بہت کم لوگوں کو ادراک ہوگا کہ آج بھی آنکھوں میں آنسو لانے والا گانا، ''اے راہِ حق کے شہیدوں''، سلیم اقبال کی دھن ہے۔یہ نسیم بیگم نے کمال گایا تھا۔ایک دن سلیم اقبال بتانے لگے کہ جب یہ گانا حد درجہ مقبول ہوگیا تو ایک دن صبح نو بجے کے قریب، ملکہ ترنم نور جہاں انکے گھر بغیر اطلاع کیے آ گئیں۔سلیم اقبال انہیں دیکھ کر حیران ہوگئے۔نور جہاں کہنے لگی کہ آپ سے لڑنے آئی ہوں۔کیونکہ یہ گانا راہِ حق کے شہیدوں، مجھ سے گوانا چاہیے تھا۔نسیم بیگم سے گوا کر حد درجہ زیادتی کی ہے۔سلیم صاحب، پریشان ہوگئے۔انکے بقول، یہ گانا صرف اور صرف نسیم بیگم کی آواز میں ہی اچھا لگتا تھا۔مگر میڈیم نور جہاں کا اپنا مزاج تھا۔یہ گفتگو کوئی ایک گھنٹہ جاری رہی۔اس پورے عرصے میں، میڈم کے خاوند، شوکت حسن رضوی نیچے گاڑی میں اکیلے بیٹھے رہے۔اس دوستی کے گلے شکوے کا اختتام کچھ اسطرح ہوا۔کہ سلیم اقبال نے اگلے چند دنوں میں نور جہاں سے ایک حد درجہ مقبول گانا گنوایا۔اسکے بول آج میرے ذہن میں نہیں ہیں۔یہ قصہ سلیم صاحب نے ہاسٹل میں متعدد بار سنایا تھا۔

اب اکثر سلیم اقبال ہاسٹل آتے جاتے رہتے تھے۔ناقدری کا عالم دیکھیے اور اس بڑے موسیقار کی اَنا دیکھیے۔کئی بار ایسے ہوا کہ

دوپہر کا کھانا انہیں گوالمنڈی میں کھاتے دیکھا۔ یہ کھانا کیا ہوتا تھا۔ایک سادہ نان اوراس پر چند پکوڑے۔اسکے بعد، پانی کے دوتین گلاس اور پھر خدا کا شکر۔کبھی بھی سلیم اقبال نے دستِ سوال یا کسی قسم کی کوئی مالی ضرورت کا اظہار نہیں کیا۔دھن بنانے کے کتنے پیسے ملتے ہونگے۔دوتین ہزار روپے۔یا شائداس سے بھی کم اوروہ بھی کافی توقف کے بعد۔سلیم صاحب کومیں نے حددرجہ مالی تنگی میں دیکھا۔مگر یہی محسوس کیا کہ وہ شخص کسی کے سامنے اپنی مفلسی کا پردہ فاش کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔عجیب شخص تھا۔حددرجہ عجیب۔مگر تمام فکری طور پر بلند لوگ، عجیب وغریب سے ہی ہوتے ہیں۔پوری زندگی اہل علم اوراہل ہنر کی صحبت میں گزاری ہے۔آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس نے اپنی صلاحیت کے برابر معاوضہ لیا ہو، یاملا ہو۔یہ لوگ مالی عذاب میں جلتے رہتے ہیں۔مگر لبوں کوسی کر زندگی گزار دیتے ہیں۔اپنی ذہنی بلندی پر فائز رہنا انہیں قبول ہوتا ہے۔مگر سفید پوشی کا بھرم توڑنا حددرجہ غیر ممکن ہوتا ہے۔سلیم اقبال اوراس جیسے کئی لوگ ہمارے منافق معاشرے کی ناقدری کا شکار رہے۔آج بھی ہیں۔سلیم اقبال تو دنیا سے اُٹھ گئے۔مگر میں اکثر اردگرد دیکھتا ہوں تو یہ طبقہ عدم توجہ کا شکار نظر آتا ہے۔پتہ نہیں کچھ لوگوں کو پسند نہ آئے۔مگر ہمسایہ ملک میں صورتحال یکسر مختلف ہے۔وہاں اہل قلم اورفنکار لوگ ماتھے کا جھومر گردانے جاتے ہیں۔انکے سماج کا اہم ترین طبقہ یہی نابغہ روزگار لوگ ہیں۔صرف تعریف ہی نہیں کرتے۔بلکہ ہمسایہ ملک میں اہل ہنر حددرجہ مال ودولت سے نوازے جاتے ہیں۔یہ لوگ انکی سوسائٹی کے دولتمند لوگوں میں آتے ہیں۔وہاں نظریہ یہ ہے کہ اس قبیل کے لوگوں کی حفاظت کی جائے۔انکی مالی مشکلات ختم کی جائیں تاکہ وہ صرف اورصرف اپنے فن پر توجہ دے سکیں۔معذرت کے ساتھ یہ ذہنی پختگی کی دلیل ہے جو ہمارے ہاں بہت کمیاب ہے۔ہمارے ہاں بحث ہی پوری دنیا سے نرالی ہے۔بلکہ کافی حدتک ادنیٰ ہے۔کون کس سے مل رہا ہے۔کون کس سے کیوں نہیں مل رہا۔چنگھاڑتا ہوا ہاتھی نما میڈیا، تمام سماج کو نفرت اورعلیحدگی کا سبق دینے میں مصروف ہے۔ہر طبقہ اپنی اپنی زہر کی دکان کھول کر بیٹھا ہے۔لوگوں کو یہی بتا رہا ہے کہ یہ زہر نہیں بلکہ شیرینی ہے۔آرام وآسائش سے استعمال کیجئے۔پرسوال پھر یہی پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس خطے میں قیامت آ تو نہیں چکی، اورہم سارے کیا دوزخ میں تو نہیں رہ رہے؟

راؤ منظر حیات